

مدرسے اور مسلم تشخص کی تشکیل

انگریزی روزنامے ”ٹائمز آف انڈیا“، نئی دہلی، کی ۷ اویں اگست ۲۰۰۳ کی اشاعت میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق میرٹھ (یوپی) سے کوئی بیس کلومیٹر کی دوری پر واقع بسا لہ گاؤں میں ایک مدرسے کے طلبہ نے یومِ جمہوریہ کے موقع پر اپنے مدرسے کی چھت پر پاکستانی پرچم لہرایا اور اُسامہ بن لادن کے حق میں نعرے لگائے۔ مگر اگلے ہی مہینے ہندی روزنامے ”نوبھارت ٹائمز“ میں ۳۰ ستمبر ۲۰۰۳ کو ایک اور خبر شائع ہوئی جس کے مطابق اس وقت کے فروغ انسانی وسائل کے وزیر مرلی منوہر جوشی نے وشو ہندو پریشد کے صدر اشوک سنگھل اور ایسے دیگر لوگوں کو چیلنج کیا جو مدرسوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مرلی منوہر جوشی نے مطالبہ کیا کہ اگر آریس ایس اور وشو ہندو پریشد جیسی تنظیموں کے لوگ مدرسوں کو دہشت گردی کے کیمپ سمجھتے ہیں تو ثبوت پیش کریں۔

مدرسوں کی سرگرمیوں پر لاتعداد رپورٹیں، ان کے حق میں یا پھر مخالفت میں، ہر طرح کے اخبارات و جرائد میں مسلسل شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ۱۹۹۸-۲۰۰۴ء کے درمیان جب مرکز میں بی جے پی برسرِ اقتدار تھی، اُس وقت ایک طرف جہاں لال کرشن آڈوانی جیسا اقلیت دشمن وزیر داخلہ مدرسوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے حق میں تھا وہیں دوسری جانب بابری مسجد کو شہید کرنے والے گروہ کا سرغنہ مرلی منوہر جوشی دینی مدارس کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ آریس ایس جیسی فسطائی تنظیم کے ہراول دستے کے ان سرغنوں کے بظاہر متضاد نظریات کا بغور جائزہ لیں تو منطقی طور پر یہ ہمیں ایک ہی دھاگے سے بندھے ہوئے نظر آئیں گے۔ ہندستان ایسے جمہوری نظام میں جہاں نام نہاد عوامی نمائندے حکومت کرتے ہیں، مختلف گروہوں کے بازار میں مسابقتی رشتوں کی ہمواری ہی کسی حکومت کے تسلسل کی ضامن ہوتی ہے؛ اور عوام کا استحصال کرنے والی ان باہم متضاد قوتوں کا اپنی بقا کے لیے اتنا eclectic ہونا لازمی ہے کہ وہ ان تمام متخالف اور مختلف شناختوں کے شعلہ بیاں بالائی طبقہ کو اپنے نظام کا حصہ بنا کر عوام کو فریب میں مبتلا رکھ سکے۔ اس طرح یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ

معاشرے کے وہ تمام پس ماندہ اور پائمال طبقات جو ان متضاد اور مختلف شناختوں کا حصہ ہیں، کسی بھی صورت میں متحد نہ ہو سکیں۔ اس طرح کے نظام میں یہ حکمت عملی اختیار کی جاتی ہے کہ پہلے کچھ قبول عام ضرورتوں/مطالبات کو اچھالا جاتا ہے اور پھر ان کی نمائندگی کرنے والے لیڈروں کو مراعات دے کر عوام کی تشفی کر دی جاتی ہے۔ اس عمل میں الگ الگ مخصوص تشخص رکھنے والے فرقوں کی ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی ہوئی بڑی stereotypical تصویر کی تشبیہ کر کے انہیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مذکورہ بیانات میں آرائس ایس اور بی جے پی جیسی جماعتوں کا مقصد اگر ایک طرف مسلمانوں کو ایک خاص امیج کے حامل ملک دشمن طبقے کے طور پر پیش کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی اقلیتی طبقے کی امیج کو زندہ رکھا جائے، اور یہ کام دوسرے بیان میں مرلی منوہر جوشی کے ذریعے کیا گیا۔ بی جے پی اگر اپنے دور اقتدار میں مدرسوں کی حمایت میں زبانی جمع خرچ کر رہی تھی تو اسے صرف اور صرف مسلمانوں کے متعلق آرائس ایس کی مذکورہ بالا حکمت عملی کا حصہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اقلیتوں کو اقلیت کے روپ میں دکھانے سے ہی سنگھ پر یوار کے ہندو توا کے ایجنڈے کو تقویت مل سکتی ہے۔

بھاجپا کی معیت میں ہندوستان کی این ڈی اے حکومت کے مدرسوں کے بارے میں اس دو غلط موقف پر مزید بحث کی گنجائش نہیں کیونکہ یہ روئے بھی اس حکومت کی کشمیر پالیسی کی طرح ہی دوغلا تھا جس کے مطابق اپنے دور اقتدار میں اٹل بھاری واجپائی تو کشمیر کے لیے نسبتاً زیادہ خود مختاری کے حق میں بیان دیتا تھا لیکن اس کا نائب آڈانی آئین ہند کے آرٹیکل ۳۷۰ کو، جو جموں و کشمیر کے علاقے کو ایک مخصوص درجہ دیتا ہے، رد کرنے کی آرائس ایس کی آفیشیل لائن کا حامی تھا۔ مدرسوں کے حوالے سے بھاجپا کے موقف پر مزید اظہار رائے کے بغیر میں اس ضمنی موضوع کو یہیں چھوڑتی ہوں اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اس بات پر خصوصی زور دینا چاہتی ہوں کہ ہندوستان میں چلنے والے مدارس اپنے مقاصد کے اعتبار سے مختلف نوعیت کے ہیں۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر انسانیت سوز حملوں کے بعد دینی مدرسوں کی جانب دنیا کی نظریں لگ گئی ہیں جو ایک فطری امر ہے، اور یہ جاننے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ خصوصاً پاکستان اور افغانستان میں واقع مدرسے عالم گیر دہشت گردی اور مذہبی شدت پسندی پھیلانے میں کس حد تک ملوث ہیں اور دہشت گردی کے کمپوں کے طور پر وہ کیا کردار ادا کر رہے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مدرسوں کے خلیفے کو سمجھے بغیر ان کے موجودہ نظام اور سرگرمیوں کو سمجھنا مشکل ہے۔ خود ہمارے ملک میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پچاس ہزار کل وقتی مدرسے ملک گیر پیمانے پر چل رہے ہیں جن میں تقریباً پچاس لاکھ طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ اس

فہرست میں جزوقتی اور شبینہ مدارس شامل نہیں ہیں۔ (ماہ نامہ ”اردو دنیا“ جولائی ۲۰۰۳ء ص ۷) یہ سچ ہے کہ ہندستان کے ان دینی مدرسوں کو افغانستان اور پاکستان کی مانند ہشت گردی کے اڈے نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن مدارس سے متعلق بے اطمینانی کا عمومی ماحول ہندستان میں بھی پایا جاتا ہے اور بہت سے لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ یا تو ان مدارس کے بنیادی ڈھانچے میں اصلاحات کی جائیں یا پھر یہ ادارے بند کر دیے جائیں۔ نام نہاد قومی سطح کے اخباروں کے صفحات پر مسلمانوں سے متعلق اکثر خبروں اور عمومی مضامین کے ساتھ بھی مدرسوں کے بچوں کی وہ تصویریں ہی شائع ہوتی ہیں جن میں وہ پتلی پتلی بچوں پر قاعدے اور سپارے رکھے اپنا سبق ازبر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسی بیشتر تحریروں میں ان بچوں کو ایسے مذہبی جنونیوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو اشارہ ملتے ہی گویا انسانی ہم میں تبدیل ہو جائیں گے۔ مدرسے کے طلبہ کی یہ عامیانہ تصویر یقیناً غلط ہے، لیکن یہ خیال کہ عموماً مدرسے والوں کا ذہنی افق وسیع نہیں ہوتا اور مدرسے اولاً ہر جدید نظریے کے مخالف ہوتے ہیں، زیادہ غلط بھی نہیں ہے۔ مدرسوں کے یہ طالب علم ٹخنوں تک (اونچا) پانچامہ اور کرتا پہنے اور سر پر گول ٹوپی چپکائے اپنی نوخیز داڑھیوں کے ساتھ جب کسی مسلمان بھائی کے گھر ”ملائوں“ کے طور پر دعوت کھانے جا رہے ہوتے ہیں تو ان کو دیکھ کر معمولی پڑھے لکھے مسلمان بھی عجیب سی ذہنی کیفیت اور الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے رویوں سے کسی طرح کے ترقی پسندانہ عمل کے لیے مسلم معاشرے کو کوئی رہنمائی مل ہی نہیں سکتی۔ مسلم فرقے کی تعلیمی اور سماجی ترقی کے خواہاں لوگوں کو بدلتے ہوئے عمومی سماجی تناظر میں ایسے بہت سے سوالوں کے جواب تلاش کرنا ہوں گے جو مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے بنیادی مسئلے کو سمجھنے کی کوشش میں مدد کریں۔ اس کے لیے کم سے کم اس قسم کے سوال تو ہر ذی ہوش مسلمان کے ذہن میں پیدا ہوں گے: اتنی بڑی تعداد میں ان کل وقتی مدرسوں کے وجود کا جواز آخر کیا ہے؟ ان کی بقا کی سماجیات کیا ہے؟ موجودہ ترقی یافتہ سماج میں یہ عہد وسطیٰ کا ادارہ اپنی نہاد میں کیوں کر زندہ رہا اور اس کی ضرورت ابھی تک عہد وسطیٰ کے ڈھانچے کے ساتھ ہی کیوں باقی ہے؟ مدرسوں سے وابستہ لوگوں کی پس ماندگی اور خود تعلیم یافتہ مسلم معاشرے میں سماجی طور پر مدرسے کے فارغین کے الگ تھلگ پڑ جانے کے اسباب کیا ہیں؟ اس افسوسناک صورت حال میں سماجی، معاشی اور اقتصادی قوتیں کس قسم کا رول ادا کرتی ہیں؟ ان پس ماندہ لوگوں کو کیا کسی طرح سے زندگی کی نئی ضرورتوں سے ہم قدم کر کے ترقی کی راہ پر ڈالا جاسکتا ہے؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوال ہر ذی شعور ہندوستانی شہری کو پریشان کرتے ہوں گے، خصوصاً ایسے دور میں جب مذہبی جنون کو ہوادے کر فضا کو مسلسل مسموم کیا جا رہا ہے۔ ایک ایسے مسلمان کے لیے جو تکثیری معاشرے میں ایک

جدید ہندوستانی شہری کے طور پر زندہ رہنا چاہتا ہے، یہ صورت حال بڑی دشوار گزار ہے۔ اس مضمون میں مذکورہ تمام سوالوں کو ذہن میں رکھ کر خصوصاً ہندوستان میں نظام مدارس کو تاریخی تناظر میں سمجھنے اور موجودہ دور میں ان کی افادیت کے تجزیے کی کوشش اس طرح کی گئی ہے کہ دینی مدارس کے خلیقے کا ان کے تاریخی تناظر میں جائزہ لیا جاسکے۔

عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں کے درمیان کوئی باقاعدہ نظام تعلیم رائج نہ تھا۔ صوفی، علماء، مشائخ، مصلحین، امرا اور رؤسا اپنی خانقاہوں اور ڈیوڑھیوں ہی کو تعلیم و تربیت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ذاتی نوعیت کے ان مدرسوں میں عموماً کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی (سید مناظر احسن گیلانی، ”ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت“، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۳۵)۔ باقاعدہ مدارس کا قیام پہلی بار غلام سلطنت کے دور میں حکمرانوں اور امرا کے ذریعے عمل میں آیا۔ (قمر الدین، ”ہندوستان کی دینی درس گاہیں“، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کا کل ہند سروے، دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۳۴)۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں مکتب لازماً چلائے جاتے تھے جہاں طالب علموں کو قرآن کی قرأت اور دینی ارکان سکھائے جاتے تھے۔ امرا کے بچوں کی تربیت کا اہتمام ان کے گھروں میں کیا جاتا تھا۔

ابتدا میں مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے الگ الگ اداروں کا کوئی تصور سرے سے نہیں تھا۔ دینی مدارس میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فلسفہ، عروض، قواعد، ریاضی، منطق، تاریخ اور جغرافیہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اگر کسی طالب علم کو کسی مخصوص علم (مثلاً طب یونانی) میں مہارت حاصل کرنی ہوتی تو پھر وہ ماہرین سے رجوع کرتا تھا۔ رموز سیاست اور سپہ گری جیسے فنون کی تعلیم امرا اور رؤسا تک محدود تھی۔ یہ طرزِ تعلیم ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے استحکام کے ساتھ ساتھ فروغ پاتا رہا۔ اکبر پہلا بادشاہ تھا جس نے تعلیم کا ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا جہاں ہندو اور مسلمان ایک ہی مدرسے میں تعلیم حاصل کر سکتے تھے، البتہ ان کو الگ الگ نصاب کے انتخاب کی آزادی تھی۔ (سلامت اللہ، ”ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم“، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۱)۔

ہندو اشراف بھی — جن میں اکثریت برہمنوں اور کائستھوں کی تھی — مغلیہ سلطنت کے زوال تک اپنے بچوں کو اسلامی تعلیم دلانے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ عام لوگوں کی تعلیم پر کسی زمانے میں بھی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ واقعاً اُس وقت کے سماجی ڈھانچے میں عوام کی تعلیم کے لیے کوئی گنجائش اس لیے نہیں تھی کہ کوئی اس کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا تھا۔ مسلم اشراف اور ان کے ہم پلہ ہندو

اشراف کو— بلکہ اگر درست لفظ استعمال کیا جائے تو علی الخصوص برہمن— جو خود کو تعلیم کے متولی اور امین سمجھتے تھے، عام لوگوں کی تعلیم و تربیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ علی گڑھ تحریک جو سرسید کی قیادت میں انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوئی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام پر منتج ہوئی، ایک ایسی تحریک تھی جس کا خلقیہ اس تصور پر مبنی تھا کہ مسلم اشراف کو جدید تعلیم سے اس لیے آشنا کرایا جائے تاکہ وہ اقتدار کے بدلے ہوئے نظام میں شراکت دار ہو سکیں۔ اس تحریک کے ”روشن خیال“ دانش وروں کے نزدیک عورتوں اور پس ماندہ ذاتوں کے لوگوں کی تعلیم کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اپنی کئی تحریروں میں سرسید احمد خاں نے عورتوں کی تعلیم کی واشگاف الفاظ میں مخالفت کی ہے۔ ان کے خیال میں عورتوں کو تعلیم دینا ”نامبارک“ بات تھی۔ انھیں یہ بھی ”یقین“ تھا کہ اگر سماج میں مردوں کے حالات درست ہو جائیں تو عورتوں کی حالت از خود درست ہو جائے گی۔ اپنے اسی نظریے کے تحت سرسید احمد خاں یہ سوچتے تھے کہ تمام ترکوششیں مردوں کے تعلیمی اور سماجی حالات کو بہتر بنانے میں صرف کی جانی چاہئیں۔ جنوری ۱۸۸۴ میں گورداس پور (پنجاب) کی عورتوں کی ایک اپیل کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ”لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمہارے لڑکوں کے لیے کرتا ہوں، درحقیقت وہ لڑکوں کیوں دونوں کے لیے ہے“ (”خطبات سرسید“، جلد اول، لاہور، ۱۹۷۲، ص ۶۶-۶۷)۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے دکن میں ۱۸۹۱ میں منعقد ہونے والی مجنوں ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں کہا تھا: ”جب مرد لائق ہو جاتے ہیں تو عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں، عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم کچھ عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے، اسی کوشش [لڑکوں کی تعلیم] کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں“ (”خطبات سرسید“، جلد دوم، لاہور، ص ۲۴-۲۳)۔ انھوں نے کانگریس کے اس مطالبے کی بھی مخالفت کی کہ معہدہ عہدوں (Covenanted Posts) پر مقابلہ جاتی امتحانات جو صرف برطانیہ میں منعقد ہوتے تھے، ہندوستان میں بھی منعقد کرائے جائیں۔ سرسید نے اس مطالبے کی مخالفت کی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے ادنیٰ طبقوں کے افراد بھی حاکم بن سکتے ہیں اور ان کا تقرر ”ہندوستان کی شریف قوموں“ کے لیے ناگوار خاطر ہوگا (”مکمل مجموعہ لیکچرز واسپیچرز“، لاہور، ۱۹۰۰، ص ۵۲-۳۵۰)۔ ان حوالہ جات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید کا تعلیمی نظریہ عملاً اور اصولاً دونوں ہی سطحوں پر اشرافیہ مسلم طبقات کی تعلیمی فلاح تک محدود تھا۔

سماج کے کمزور طبقات کے تئیں مسلم اشراف کے اس رویے نے مسلمانوں میں طبقاتی فرق کو مزید بڑھایا اور عالموں، قاضیوں، مولویوں اور حکیموں کی الگ الگ ذاتیں مستقل حیثیت اختیار کر گئیں جو مسلم اشراف یا

اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ بھی ذات پات میں یقین رکھنے والے ہندوؤں کی طرح کی معاشرتی تفریق میں یقین رکھتے تھے۔ حالانکہ مذہباً اسلام میں چھوت چھات کے لیے کوئی جگہ نہیں، پھر بھی مقامی تہذیبی اثرات کے تحت ہندستان میں مسلمانوں کا پورا سماج دو طبقوں میں تقسیم تھا—شریف اور ذلیل (قمر الدین، ”ہندستان کی دینی درس گاہیں“، دہلی ۱۹۹۶ء، ص ۳۵)۔ مسلمانوں میں تقسیم ہندستان تک یہ غیر تحریر شدہ قانون بھی تھا کہ رذیلوں میں سے کوئی بھی شخص—مثلاً نائی، بڑھئی، لوہار، جلاہا—کسی مسجد کا امام یا شہر کا قاضی نہیں بن سکتا تھا۔ قاضیوں کی حد تک یہ قانون آج بھی مروج ہے۔ اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کا تعلیمی نظام اپنے خلیفے میں ہندوؤں میں مروج تعلیمی نظام سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا جہاں پاٹھ شالاؤں اور گرگھوڑوں میں صرف برہمن اور دُوج ہی داخل ہونے کے مجاز تھے۔ ہندو اور مسلم دونوں طرح کے نظام ہائے تعلیم اپنے اپنے طبقات کے صرف اشراف کے لیے ہی مروج تھے۔

لیکن کسی بھی سماج میں اس طرح کا نظام تعلیم دیر تک حاوی نہیں رہ سکتا، مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ ہر سماجی نظام کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ حاشیے پر جینے والے لوگ مقتدر طبقے کی تہذیب کو تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اُس کو اختیار بھی کرنا چاہتے ہیں، جس کی وجہ سے نام نہاد تہذیبوں کی توسیع کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ ماہرین سماج بھی مختلف سماجی گروہوں کے طرز زندگی کے مطالعات و مشاہدات کے ذریعے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ کم ترقی یافتہ طبقے ہمیشہ آگے بڑھنے اور برسرِ اقتدار طبقے کی تہذیب و ثقافت کو اختیار کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ سے ایسی متعدد مثالیں مل جائیں گی کہ بہت سے ایسے شاعر بھی گزرے ہیں جو پیشے کے اعتبار سے درزی، باورچی، نائی، سٹے، سپاہی وغیرہ تھے، طوائفیں اور ان سے متعلق دیگر لوگ بھی شعروادب کے رسیا تھے—اور یہ اس بات کے باوجود تھا کہ ادب کو عموماً تعلیم یافتہ اعلیٰ طبقے کی میراث تصور کیا جاتا تھا (محمد حسن، ”دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر“، نئی دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۹۸)۔ اعلیٰ طبقے کے غیر مسلم اور کایستہ بھی مسلمانوں کی طرح کی ہی تعلیم حاصل کرتے تھے اور بڑی آسانی سے اسلامیات کے (غیر مسلم) عالم بھی تسلیم کر لیے جاتے تھے کیونکہ وہ مشترک مقتدر تہذیب کی پیداوار ہوتے تھے اور ان کے تہذیبی رویے اعلیٰ مسلم طبقے کے رویوں سے قطعی مختلف نہیں تھے۔

برطانوی حکومت کے اثرات:

برطانوی راج قائم ہوا تو ہندستانی معاشرے میں زبردست تبدیلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ تعلیمی نظام اس وجہ

سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا کہ برطانوی حاکموں نے اپنے مفادات کے پیش نظر عوامی تعلیم کی طرف توجہ کی مگر جدید یا مغربی تعلیم کے خلاف تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا (گیلانی، ”ہندستان میں...“ ص ۳-۳۰۲ اور ص ۱۸-۳۱)۔ جن لوگوں کو بدلتے وقت کے ساتھ بدلنا منظور نہ تھا انھوں نے بہاؤ کے خلاف تیرنے کی کوشش کی۔ دینی مدارس وقت کے پیسے کو الٹا گھمانے کی کوشش کرنے والے اس دستے کے سپہ سالار ٹھہرے اور ایک طرح سے سامراجی حکومت کے خلاف مدافعت کی علامت کے طور پر دیکھے جانے لگے۔ برطانوی نظام کی یہ مخالفت بعد میں ان روایتی مذہبی اداروں کی جنگِ آزادی میں شمولیت پر منتج ہوئی۔ دیوبند تحریک، وہابی تحریک، اور خلافت تحریک کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ لیکن دینی مدرسوں کی طرف سے برطانوی راج کی مخالفت کا ایک اور نتیجہ بھی سامنے آیا کہ مغربی تہذیب کی مخالفت میں کامیابی کے سبب دینی مدرسے اپنے مقاصد اور نظریات میں مزید شدت پسند ہو گئے۔ ان کے نصابات کی معاصر زندگی میں اہمیت معدوم ہونے لگی اور اپنی افادیت کھونے کے سبب وہ وقت کا ساتھ دینے سے رفتہ رفتہ قاصر ہو گئے۔

سیاسی حالات کے سبب مغربی تعلیم کا پھیلاؤ لازمی تھا۔ خصوصاً ان لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جو برٹش راج کے نئے سروس سیکٹر میں شامل ہونے کے خواہاں تھے۔ اسی کے ساتھ یہ سوال مزید شدت پکڑنے لگا کہ بدلتے معاشی اور سیاسی منظر نامے میں تہذیبی رواداری کا مطلب کیا ہے اور نئے حالات سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جائے۔ ہندستان میں کسی بھی مذہبی طبقے میں اس سوال پر اتفاق رائے نہ تھا۔ مسلمانوں میں وہ لوگ جو معاشی طور پر پسماندہ تھے وہ اپنے روایتی نظامِ تعلیم اور مشرقی اقدار کے نعروں سے چپکے رہے۔ دوسری طرف آسودہ حال لوگ نئی تعلیم اور مغرب کے حمایتیوں کے طور پر میدان میں اتر آئے۔ بعد میں یہی مغربی تعلیم یافتہ طبقات نئے سیاسی نظام کے ہراول دستے میں بھی شامل رہے۔

سماج میں ایک اور بڑی تبدیلی بھی آرہی تھی۔ انصاف و مساوات کے نئے پیمانوں کے طفیل عام لوگوں کے لیے بھی نئی تعلیم کے دروا ہونے کے امکانات بڑھ گئے تھے۔ ہندوؤں کے تمام طبقات تو سیاسی و معاشی نظام کے ہر شعبے میں حصے داری چاہتے تھے۔ مسلمانوں میں نئے طبقات یعنی پسماندہ عوام کی پہلی نسل کی تعلیمی دائرے میں شمولیت دینی مدارس کے ذریعے ہوئی اور یہ وقت مدرسوں اور مسلم تعلیم کا وہ اہم موڑ تھا جس میں ایک طرف تو ان دینی مدرسوں میں جواب تک بالعموم اشراف کے لیے مخصوص تھے، عام مسلمان کو جگہ ملنے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ دوسری طرف دینی مدارس کو ان طبقات کی شمولیت سے ایک نئی زندگی مل گئی۔ بعد کے دور میں مسلم اشراف نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے تو دینی مدارس کو مکمل طور پر خیر باد کہہ دیا مگر عام مسلمانوں کو

ذہنی طور پر پسماندہ رکھنے کے لیے ان مدارس کی آبیاری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے جو طبقات پہلی دفعہ تعلیم کے دائرے میں آرہے تھے انھوں نے اپنے بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے ان ہی روایتی مدرسوں میں بھیجنا شروع کیا جن کو وہ بہ وجہ تعلیم و تعلم اور علم کا سب سے بڑا مرکز سمجھتے تھے۔ اس رجحان کے سبب مسلم عوام کی ذہنی ساخت میں جو تبدیلیاں آئیں، مذہبی تعلیمات اور مذہبی شناخت پر اصرار کو اس میں نمایاں حیثیت حاصل ہوئی۔ صورت حال یہ تھی کہ وہ مسلمان بھی جو نظر تازہ رکھتے تھے اور سائنٹفک تعلیم کے حامی تھے، عام مسلمان کو دینی مدارس کا ذہنی قیدی بنائے رکھنے کی غرض سے مذہبی اور سیکولر تعلیم کے انکار کا نعرہ پوری قوت سے لگاتے تھے۔ مسلم فرقے کو اس ذہنیت سے آج تک نجات نہیں ملی ہے۔

اشرافیہ کی روایت کا اصول یہ ہے کہ وہ تمام شعبہ ہائے زندگی کو اپنا دست نگر رکھتی ہے۔ اسی کلیے کے مطابق مسلم اشراف نے بھی نظام مدارس کے ساتھ ساتھ نئی تعلیم کی درس گاہوں پر بھی اپنی گرفت مضبوط کی۔ روایتی تعلیم کے عالموں اور مبلغوں کی صورت میں جہاں ایک طرف انھوں نے اپنے دینی بھائیوں پر اپنا اقتدار جمائے رکھا وہیں دوسری طرف اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیجنے کا بھی کوئی موقع انھوں نے نہیں گنوا یا۔ اردو کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی، جنھوں نے مغربی تہذیب کی مخالفت میں اکثر غیر معقول موقف اختیار کیا، اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے اسی برطانوی کلچر کے حوالے کر دیا جس کے وہ اپنی شاعری میں شدید مخالف تھے۔

جدید تعلیم کے رجحان کو فروغ ملنے کے بعد صورت حال کچھ یوں بنی کہ مدرسوں میں تعلیم کی غرض سے آنے والے مسلمان بڑی تعداد میں نچلے طبقات سے آنے لگے۔ ان میں سے بیشتر چونکہ نیم خواندہ یا ناخواندہ گھرانوں سے آتے تھے اس لیے عربی اور فارسی کا نصاب تعلیم ان کے لیے مسئلہ بن گیا۔ ان کی تعلیم کا بیشتر وقت ان زبانوں کو سیکھنے میں صرف ہو جاتا تھا اور اکثر صورتوں میں وہ ان میں درک حاصل کرنے میں ناکام رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے دینی مدارس کا معیار تعلیم بتدریج زوال کی سمت بڑھنے لگا۔ یہی وہ دور تھا جب مغل حکومت کا زوال بھی اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا تھا اور فارسی زبان مقتدر طبقے کی زبان والی اپنی حیثیت کھو رہی تھی اور اس کی جگہ اردو چلن میں آچکی تھی۔ دینی مدارس کے نظام میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی غرض سے مذہبی ادب کے اردو ترجمے کا عمل شروع ہوا مگر اس کے لیے جس دقت نظر کی ضرورت تھی وہ مفقود رہی کیوں کہ مغربی تعلیم یافتہ طبقے کو اس کی کوئی فکر نہ تھی۔

نئے سیاسی نظام میں جب نئے ہندو طبقات منظرِ عام پر آنے لگے تو سیاست کے روایتی ڈھرے بھی چرمرائے اور مسلم عوام پر سے مقتدر مسلم اشراف کے اقتدار کی ڈور پھسلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ صورتِ حال کو قابو میں رکھنے کے لیے لازم تھا کہ ہر قسم کا حربہ استعمال کیا جائے۔ مسلم اشراف کی خوش قسمتی سے حالات بھی ایسے تھے کہ وہ مذہب کے ہتھیار کو فوراً استعمال کر سکتے تھے۔ یہ استعمال وہ مغربی اثرات کو دور رکھنے کے نام پر لیکن واقعاً عوام پر اپنے غلبے کو برقرار رکھنے کے لیے کر سکتے تھے۔ بہ صورتِ دیگر آئندہ دنوں میں نئی تعلیم سے ان کے سماجی نظام کے زیرِ زبر ہونے کے امکانات بھرپور تھے۔ وہابی اور دیوبند تحریکوں (جن کا مقصد مسلم اقتدار کی شاندار عظمت کے احیا کو نعرے کے طور پر استعمال کرنا تھا) سے لے کر علی گڑھ تحریک اور تحریکِ خلافت تک، سبھی نے عوام کی سیاسی بے چینی اور اقتصادی بد حالی کا فائدہ اٹھا کر اپنے مقاصد کے حصول کی کوششیں کیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے فطری طور پر مسلمانوں کے مذہبی تشخص پر سب سے زیادہ زور دیا کیونکہ یہی وہ شعبہ تھا جو ان کے مقاصد کے حصول کی راہ ہموار کرتا تھا۔

مسلم تشخص کی تشکیل:

اس طرح ہر زمانے میں دینی مدارس کے ذریعے تبدیلیوں کے ساتھ جو بھی نظامِ تعلیم رائج ہوتا رہا وہ جاگیرداری سماج کے مفادات کا ہی آئینہ دار ہوتا تھا، یوں عملاً عام مسلمان کا ذہن سیاسی بیداری کی طرف منتقل نہیں ہوا۔ اصولاً ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کم از کم آزادی کے بعد ہندوستان میں جمہوریت اور روشن خیالی کی نئی اقدار کے ساتھ جاگیردارانہ عہد کا یہ تعلیمی نظام آہستہ آہستہ کمزور ہوتا جاتا، مگر ظاہر ہے کہ ہوا اس کے برعکس۔ جماعتِ اسلامی جیسی تنظیموں نے جن کے قیام کا ایک مقصد مذہب کے نام پر جاگیرداروں کے حقوق کی نمائندگی اور تحفظ بھی تھا، مسلم عوام پر سیاسی اور مذہبی میدانوں میں غلبہ حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں جن میں کامیابی کے سبب جاگیردارانہ نظام کی باقیات میں دینی مدرسے ایک نئی قوت کے ساتھ سماجی منظر نامے پر نمودار ہوئے۔ مذہب کے لبادے میں جماعتِ اسلامی نے آمریت کی کھل کر حمایت کی۔ آزادی کے بعد جماعتِ اسلامی اور متعدد دیگر جماعتیں مذہب کے سہارے تبدیل شدہ لائحہ عمل کے ساتھ کس طرح سے جاگیرداری نظام کی بقا کے لیے سازشوں میں مصروف تھیں، اس کا ثبوت جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا مودودی کے درج ذیل بیان سے ملتا ہے جو ان کی کتاب ”رسائل و مسائل“ میں موجود ہے:

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اسلام انفرادی حقِ ملکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن قومی ملکیت کی اسکیم کو عملی جامہ

پہنانے کی خاطر یہ کہاں درست ہے کہ کوئی پارلیمنٹ ایک حکم کے ذریعے سے اراضی اور دیگر ذرائع پیداوار پر سے افراد کی نجی حقوق کو ساقط کر کے ان پر اجتماعی حقوق قائم کر دے؟ زمین کی ملکیت اور جاگیروں کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ زمینی جائیداد اور جاگیر کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ اگر پیداوار کے دیگر ذرائع مثلاً ملوں اور فیکٹریوں کی بات کی جائے، تو ان کے قومیا نے کا تھوڑی ہی اسلام کے بنیادی نظریے کے یکسر خلاف ہے۔ (بحوالہ کے ایم اشرف، *An Overview of Muslim Politics in India* مائیک بلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۰۱ء ص ۱۴۳)

مذہب کے نام پر اس قسم کے پروپیگنڈے نے ناخواندہ عوام کو بالکل خاموش کر دیا اور جاگیر داری نظام کا خلقیہ متعدد نئے سماجی اداروں اور رویوں میں تبدیل شدہ شکل میں پھلتا پھولتا رہا۔

رفتہ رفتہ ایک ایسا تعلیمی نظام مدرسوں کی صورت میں پھیلتا رہا جس کے ساتھ ساتھ مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے مسموم پروپیگنڈے نے ایک ایسے مسلم شخص کی تشکیل میں فعال کردار ادا کیا جس کے مطابق مسلمانوں کی امیج آزادی کے بعد کے اس اہم دور میں جب تمام معاشرہ نظام کہن کو خیر باد کہہ کر نئی اقتدار کی تشکیل کے عمل سے گزر رہا تھا، ایک روایتی، بنیاد پرست اور اپنے ہی خول میں بند رہنے والے فرقے کے طور پر سامنے آئی۔ اکثر دینی مدرسے مفاد پرست لوگوں کا آئہ کار بن گئے۔ ان مفاد پرستوں نے اسلام کی صرف ان تعلیمات کی تبلیغ کو فروغ دیا جو انھیں اپنے مفاد میں سب سے بہتر نظر آئیں۔ مثلاً یہ کہ عام لوگ ائمہ اور علماء کی اتھارٹی کے بارے میں کسی قسم کے سوال نہ اٹھائیں اور مذہبی معاملوں میں عقلیت پسندی کا ثبوت نہ دیں بلکہ یہ مانیں کہ عقیدہ ہی سب کچھ ہے؛ جس کے بارے میں عام آدمی کو سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ علماء نے حقوق عباد کے مقابلے میں دینی ارکان کی پابندی پر اسی لیے مصلحتاً زیادہ زور دیا اور ہر مذہبی فریضے کی ادائیگی کے بدلے میں عالم بالا میں بے شمار ثواب ملنے کے خواب بہ کثرت دکھائے کہ دنیا اور اس کے معاملات پس منظر میں چلے جائیں۔ نیم تعلیم یافتہ عوام کے لیے ایسی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں درج طریقوں کے مطابق مذہب کی تقلید کرنے کی اپیل کی گئی ہے۔ تبلیغی جماعت نے از خود یہ ذمہ داری لے لی کہ وہ تبلیغی نصاب کی مدد سے ناخواندہ اور بے علم مسلمانوں کے درمیان مذہب کا پیغام پھیلائے گی۔ جماعت کے تبلیغی نصاب میں نماز، روزہ، حج جیسے فرائض پر اسباق کے علاوہ تبلیغ کے فوائد بھی بیان کیے گئے ہیں جن میں بہت سے جھوٹے سچے اور من گھڑت قصوں کی مدد سے ایک مبینہ سچے مذہب پر چلنے کی راہ دکھائی گئی ہے۔ قرآن کا حوالہ دے کر تبلیغی جماعت کے لوگ یہ بھی تبلیغ کرتے اور کہتے ہیں کہ جو لوگ ایمان والے ہیں اور جنھوں نے عمل صالح کیا، اُن

کو اللہ زمین پر اقتدار بخشے گا، ان کو حیاتِ طیبہ دے گا (مولانا وحید الدین خاں، ”تبلیغی تحریک“، نئی دہلی ۱۹۹۴ء، ص ۲۱)۔ تبلیغی جماعت کے مبلغین کا تقاضا اپنے پیروکاروں سے یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی لوحِ تقدیر پر مکمل یقین رکھیں یعنی اپنے آپ کو مکمل طور پر تقدیر کے حوالے کر دیں، بد حالی اور غربی میں بھی صبر و قناعت سے کام لیں کیونکہ صبر کرنے والوں کو مرنے کے بعد بہتر زندگی ملے گی۔ بالواسطہ اس پیغام کا یہ مطلب ہوا کہ چونکہ تقدیر پہلے ہی لکھی جا چکی ہے یوں حالات کو بدلنے یا بہتر بنانے کی ساری تدبیریں بیکار ہی ہوں گی، اس لیے تقدیر کو چپ چاپ تسلیم کر لو۔ دنیا سے بے رخی، عالمِ بالا کی بہتر زندگی اور صبر و قناعت کی تلقین و تعلیم میں غریبوں کے لیے بڑی کشش ہوتی ہے کیونکہ بس اتنا خیال ہی ان کے لیے باعث تسکین ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہی سہی، کبھی تو دن پھریں گے۔ انھیں یقین ہوتا ہے کہ صبر و قناعت کی وجہ سے خدا انھیں زیادہ عزیز رکھتا ہے اس لیے معاشی بد حالی کے تدارک کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہندستان میں اسلام کا الگ رنگ ہے تو وہ یہی اسلام ہے۔ غریب مسلمانوں کا اسلام، کیوں کہ عرب دنیا کے صاحبِ ثروت لوگوں کا اسلام تو ہندستان کے غریبوں کے اسلام سے یکسر مختلف ہے۔ اس طرح یہ طرزِ فکر عام لوگوں کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئے راستے دکھانے کے بجائے حاشیے پر دھکیلتا رہتا ہے اور انھیں اپنے خدا سے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ اسلام کے اسی روپ کا ایک براہِ راست نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہندستان کی حد تک غیر مسلموں اور غیر مذہبی اقلیتوں کے تقابل میں مسلمان سماجی اور تعلیمی طور پر بہ حیثیت مجموعی پس ماندہ ہیں۔

حالانکہ انگریزوں کے لائے ہوئے نئے تعلیمی نظام اور مسلم تعلیمی نظام میں براہِ راست کشاکش نظر آتی ہے لیکن اس صورتِ حال کا سارا فائدہ پہنچا ہے زمینداری نظام کے پروردہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے کو۔ انھوں نے مسلمانوں پر اجارہ داری بھی قائم رکھی اور نئے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ اس طرح دیکھا جائے تو آج بھی مسلمانوں کا روایتی تعلیمی نظام دراصل جاگیردارانہ سماج کے مفادات کا آئینہ دار ہے۔

مدرسے اور ترقی:

جاگیردار اشراف نے روایتی تعلیم کو زندہ تو رکھا لیکن جیسا کہ میں نے بار بار عرض کیا، صرف غریبوں کے لیے، اور پھر اس کی باگ ڈور بھی اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اس کا غالباً ایک سبب یہ تھا کہ مذہب کے نام پر تیار کیا گیا ایک

بڑا گروہ بدلتے ہوئے نئے جمہوری سماج میں ان کے لیے اقتدار کے حصول کا ایک طاقت ور ذریعہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اس طرح جاگیرداروں کے اقتدار کی بقا دراصل ایک ایسے نظام کی بقا میں پوشیدہ تھی جس میں جاگیردارانہ اقتدار زندہ اور قائم رہ سکیں۔ غریب مسلمانوں کو جاگیردارانہ اقتدار کی پروردہ مسلم سیاست نے مسلسل یہ یقین دلایا کہ ان کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ، یعنی اسلام، خطرے میں ہے۔ اس لیے ہر زمانے میں غریب مسلمانوں کا ایک نکاتی ایجنڈا یہ رہا کہ وہ روایتی تعلیمی نظام کی ہر طرح سے حفاظت کریں گے، اسے ختم نہیں ہونے دیں گے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دیں گے کیوں کہ ان کے خیال میں مدرسوں کی حفاظت دراصل اسلام کی حفاظت تھی۔ آج بھی یہ تصور مسلمانوں کے درمیان عام طور پر رائج ہے کہ مدرسے ہی دراصل وہ ادارے ہیں جنہوں نے اسلام کو بچانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ عام غریب مسلمان جو یہ سمجھتا ہے کہ دینی مدرسوں نے اسلام کو زندہ رکھا ہے، اس کا ذہن سامنے کی اس حقیقت کی طرف منتقل نہیں ہوتا کہ وہ سب محترم حضرات جنہوں نے انہیں مدرسوں کی طرف راغب کیا ہے، خود اپنے بچوں کو اچھے سے اچھے اسکولوں یہاں تک کہ پبلک اسکولوں اور کانونٹوں میں بھی بلا تکلف اور فخر و مباہات کے ساتھ تعلیم دلاتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ اور امریکہ بھیج کر نفسِ اتارہ کو خوب خوب موٹا کرتے ہیں۔ مسلم عوام کی عمومی سیاسی کم فہمی اور تعلیمی پس ماندگی کے سبب یہ روایتی تعلیمی نظام آج بھی اسی طرح سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے جس طرح یہ آزادی سے پہلے تھا۔ تبدیلی صرف اتنی واقع ہوئی ہے کہ اب ہندوستان میں یہ نظام جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان میں ایسے بھی بہت سے لوگ مل جائیں گے جنہوں نے سینٹ اسٹیونز کالج اور دہلی پبلک اسکول جیسے قابل رشک اداروں میں تعلیم پائی لیکن کیریئر یہ منتخب کیا کہ غریبوں کے اسلام سے وابستہ ہو کر تقدیم حاصل کرو۔ (چند برس پہلے میری ملاقات جمعیتہ العلماء ہند کے صدر دفتر، دہلی، میں ایک ایسے ہی صاحب سے ہوئی تھی جو سینٹ اسٹیونز کالج کے سابق طالب علم ہیں اور اب جمعیتہ العلماء ہند کے ایک اہم عہدے پر فائز ہیں۔ یقیناً اس کیریئر کے سبب انہیں جلد یا بہ دیر کوئی نہ کوئی قائدانہ رول بھی مل جائے گا اور کم سے کم سماج میں ایک منفرد معزز مقام تو مل ہی گیا۔) علماء اور مولویوں کے طبقے میں مذہب سے باہر شادی کرنے کی بھی خاصی مثالیں مل جائیں گی۔ ہر قسم کے سیاسی اقتدار کے لیے مسجد کے اماموں کی سیاست کرنے والے جمیل الیاسی کے صاحبزادے معروف ٹی وی اینکر صہیب الیاسی کی مثال تو ہمارے زمانے میں سامنے کی ہے۔ وہ نہ صرف انگریزی تعلیم یافتہ ہیں بلکہ انھوں نے ایک غیر مسلم خاتون سے شادی بھی کی ہے۔ مولویوں اور عالموں کے یہ خاندان اتنی ہی جدید روش پر زندگی گزارتے ہیں جتنے کہ دیگر ماڈرن ہندو یا مسلمان۔ لیکن

مدرسوں کے روایتی نظام کو زندہ رکھنے کے بارے میں ان کے جو رویے ہیں ان سے یہ پوری طرح ثابت ہے کہ اس استحصال کرنے والے نظام کو زندہ رکھنے سے چوں کہ ان کے ذاتی مفادات وابستہ ہیں، سو وہ اس کی بقا کی کوششوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔

جب غریب مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مدرسے کے نظام کی تشکیل کی گئی تھی تب مسلمانوں کے لیے کسی اور صورت سے تعلیم کا حصول ممکن نہیں تھا، لیکن اب یہی نظام ان کی تعلیمی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ مدرسوں کے تمام اخراجات، طلبہ کے کھانے پینے اور رہائش کے انتظامات مسلمان چندے اور زکوٰۃ سے پورے کرتے ہیں لیکن نظام کچھ ایسا بن گیا ہے کہ مدارس کی آمدنی کا بڑا حصہ طلبہ کے بجائے مدرسوں کے مہتممین پر خرچ ہوتا ہے۔ تین سو برس سے بھی زیادہ قدیم درس نظامی کو اب تک جس طرح اپنی اصل شکل میں قائم رکھا گیا ہے اس کے سبب یہ بھی خرابی پھیلی ہے کہ طالب علم عصر حاضر کی ضرورتوں اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو پاتے۔ نہایت دقیق اور ازکار رفتہ عربی اور فارسی نصاب کی کتابیں طالب علموں میں شاید ہی کوئی دل چسپی اور خود سے کچھ اور پڑھنے کی خواہش پیدا کر پاتی ہوں۔

تعلیمی اور سماجی طور پر پس ماندہ طبقات سے آنے والے بہت سے مسلمان طالب علم مذہب کی تعلیم اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ مذہبی ارکان سکھانے اور قرآن پڑھانے کی نوکری یا یوں کہیے کہ سفید پوش مزدوری حاصل کرنا نسبتاً آسان ہے، اس طرح انھیں کم از کم دو وقت کی روٹی نصیب ہو جاتی ہے۔ قصوں اور دیہاتوں کی مسجدوں میں مؤذن یا امام کے طور پر یا پھر مدرسے کے طور پر انھیں کام مل جاتا ہے۔ یہ نظام سیکڑوں برس سے اسی طرح جاری ہے اور بدلنے کے آثار دور تک نظر بھی نہیں آتے۔ چھوٹے چھوٹے مدرسے آج بھی جگہ جگہ کھل رہے ہیں اور ان سے مدرسوں کے بے روزگار فارغین کو روزگار بھی مل جاتا ہے۔ اس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حکومتوں کے لیے مدرسے ایسی نعمت غیر مترقبہ بن گئے ہیں جس کے لیے وہ مدارس کے ذمے داران کے جتنے بھی تشکر ہوں، کم ہے۔ یہ مدارس بے روزگاروں کی بڑی تعداد میں روزگار کے مطالبے کی صلاحیت ہی کو سلب کر لیتے ہیں اور مدارس کے فارغ بے روزگار دو وقت کی روٹی اور چند جوڑے کپڑوں کے حصول کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں۔ بے روزگار جوانوں کا ایسا مطمئن طبقہ دنیا میں دوسرا نہیں ملے گا۔ اسلام جو اپنے ماننے والوں سے جدوجہد اور حرکت کا مطالبہ کرتا ہے، ہمارے معاشرے میں ہر طرح کے منفعل رویوں کا استعارہ بن کر رہ گیا ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندوستان کی سرزمین پر جمہوری نظام آنے کے ساتھ آہستہ آہستہ کل وقتی دینی

مدارس کا یہ روایتی نظام ختم ہو جاتا اور اس کی جگہ آج کی ضرورت کے مطابق ہی دینی مدارس باقی رہتے جو مساجد کے ائمہ کی تعلیم و تربیت کے مرکز ہوتے، نیز یہ مدارس عصری ضرورتوں کے مطابق اپنے نصاب کو از سر نو ترتیب دیتے؛ لیکن کئی اسباب سے ایسا نہ ہو سکا۔ نام نہاد جمہوری حکومتوں نے بھی بے حسی کی پالیسی اختیار کی اور اس طرح مسلمانوں پر نئی تعلیم کی روشنی کے دروازے بند رہے۔ آزادی کے بعد زمینداری نظام ختم کیا گیا تو اس کی زد یوپی (آزادی سے پہلے کے صوبہ متحدہ) میں مسلمان زمینداروں پر زیادہ پڑی تھی کیوں کہ مسلمان زمینداروں کی سب سے زیادہ تعداد یوپی ہی میں تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ہندو زمینداروں کی بہ نسبت مسلم زمیندار ساز کے اعتبار سے کہیں چھوٹے اور تعداد میں کم تھے مگر وہ جس خواب غفلت میں تھے وہ اپنی مثال آپ تھا۔ آزادی کے بعد زمینداری ختم کرنے کی کانگریس کی اعلیٰ شدہ پالیسی پر انھوں نے ذرا بھی کان نہیں دھرا اور زمینداری ختم ہونے کے بعد انتہائی تنگ دستی کی حالت میں برسوں تک پاکستان کا رخ کرتے رہے۔ حکومت نے جس سیاسی قوت کے ساتھ زمینداری کا خاتمہ کیا تھا اُس قوت کے ساتھ عام مسلمانوں کے درمیان نئی تعلیم کو متعارف کرانے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ اس طرح گو کہ زمینداری کا خاتمہ ہو گیا لیکن اس مسلم معاشرے کے جاگیردارانہ مزاج میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو سکی جس کے خلیقے کی تشکیل میں روایتی مذہبی اداروں کا اہم رول رہا تھا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسا مؤثر متبادل تعلیمی نظام وجود میں آئے جس میں عام مسلمان یہ محسوس نہ کرے کہ اس کی اسلامی شناخت معدوم ہو رہی ہے۔ یہ کام اس طرح کیا جاسکتا تھا کہ ابتدا ہی سے مسلمان بچوں کے لیے پرائمری سطح پر اردو ذریعہ تعلیم سے سیکولر تعلیم کی وکالت کی جاتی۔ مگر اس مطالبے اور اس کے نفاذ کے لیے جس سیاسی بصیرت کی ضرورت تھی وہ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلم سیاسی رہنماؤں میں موجود نہ تھی۔ نتیجتاً اردو کا مطلب مذہب ٹھہرایا زیادہ سے زیادہ اردو ادب۔ اردو تعلیم اور دینی تعلیم یا دینی مدارس کی نہج پر کسی اور قسم کی [متبادل] تعلیم کا تصور کسی کے ذہن میں صاف نہ تھا۔ آزادی کے بعد اردو تعلیم کے مختلف نام ٹھہرے جس کا سب سے زیادہ فائدہ دینی مدارس کو ہوا۔ آزادی کے بعد شمالی ہند کے اسکولی تعلیمی نظام میں ہندی میڈیم میں ایسے نصاب کو داخل کر دیا گیا کہ عام مسلمان تو کیا متوازن ذہن کا ہندو بھی اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں بھیجنا پسند نہ کرے۔ واضح لفظوں میں کہا جائے تو شمالی ہند میں رائج نام نہاد سیکولر نصاب فرقہ وارانہ خطوط پر مرتب کیا گیا نصاب ہے جس کے رد عمل نے دینی مدارس کے نظام کو نئی قوت اور توانائی بخشی ہے۔

اس پس منظر میں مدرسوں کو تنگ نظر اور کٹر ادارے کہہ دینا مسئلے کا بڑا سہل پسندانہ تجزیہ ہے۔ مثال کے

طور پر مکتب کو لیجیے جہاں بچے کو قرآن اور نماز وغیرہ پڑھنا بھی سکھایا جاتا ہے، اور اس طرح بچے کو مذہب کے بنیادی ارکان سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ مکتب تقریباً ہر محلے کی مسجدوں میں کل وقتی اور جز وقتی دونوں طرح سے چلائے جاتے ہیں اور ان میں پڑھنے والے طالب علم بھی ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عموماً اسکول میں کلاسوں میں حاضری دینے کے بعد ہی طلبہ جز وقتی اور بالعموم شبیہ مکتبوں میں مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جاتے ہیں۔ اصطلاحی دینی مدرسوں کا نمبر اس کے بعد آتا ہے، جہاں بالخصوص مذہبی نصاب کی مدد سے کل وقتی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ ادارے رہائشی اور غیر رہائشی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ اصطلاحی دینی مدارس کا یہ ایک علاحدہ اور قائم بالذات نظام تعلیم ہے۔ گاؤں، قصبوں اور شہروں سبھی جگہ ان مدرسوں کے اخراجات زیادہ تر زکوٰۃ اور چندے پر منحصر ہوتے ہیں۔ رہائشی مدرسوں میں عموماً بے حد غریب طبقوں کے بچے آتے ہیں اور اس طرح یہ مدرسے والدین کو بے فکر کر کے ان بچوں کی پرورش کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔ بہت سے یتیم خانے بھی اپنے یہاں اسی طرح کی مذہبی تعلیم کا اہتمام کرتے ہیں۔ مذہبی تعلیم کے اعلیٰ ترین اداروں سے مذہب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو چھوٹے مدرسوں میں، مکتبوں اور مسجدوں میں تعلیم و تعلم اور مذہبی ارکان ادا کرنے کا روزگار مل جاتا ہے اور اس طرح مدرسوں کا یہ نظام امداد باہمی کے اصول پر چلتا ہے اور خاصاً مضبوط ہے۔ بڑے مدرسوں سے فارغ ہونے والے طالب علم کو عموماً یا تو چھوٹے مدرسوں میں نوکری مل جاتی ہے یا پھر وہ اپنا ایک چھوٹا مدرسہ یا مکتب کھول لیتا ہے اور اس طرح یہ نظام مسلسل وسعت پذیر ہوتا جاتا ہے۔ مدارس کی تعداد میں مسلسل اضافے کا یہ لازمی اور منطقی نتیجہ ہے کہ نئے مدارس کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور فرقہ وارانہ سیاسی تنظیمیں اور تحریکیں مسلسل زور پکڑ رہی ہیں۔ مدارس اور مساجد کی تعداد میں مسلسل اضافے اور مسلمانوں میں فرقہ واریت کی ساجیات کو کسی پیچیدہ بحث یا مسلم معاشرے کی اقتصادی اور سماجی تہوں کی پیچیدگی کے ”عالمانہ“ تجزیے کے بغیر بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ سامنے کی ایسی حقیقتوں کو خواہ مخواہ پیچیدہ کرنے کی منطق صرف ان مسائل سے فرار ہے جن کا حل ذہنی اور عملی سطح پر خون جگر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اگر مسلم علماء اور مذہبی رہنما غور کرتے اور اپنے سماج میں تبدیلی لانا اور اسے ترقی یافتہ بنانا انھیں مقصود ہوتا تو وہ زکوٰۃ اور وقف کے پیسے سے جدید تعلیم کے با معنی ادارے قائم کرنے/کرانے کی طرف توجہ دیتے، لیکن وہ ایسا نہیں کرتے، اس لیے کہ اس سے ان کے ذاتی مفادات کو زک پہنچنے کا خطرہ رہتا ہے۔ ایک جدید ریاست میں اس طرح کے ادارے عوام کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے ان پر کسی قسم کی پابندی بھی نہیں لگائی جاسکتی۔ ویسے بھی مفاد پرست عناصر انھیں ہوا دیتے رہیں گے۔ فرقہ پرست عناصر کی اپنی طاقت ہوتی

ہے جس کو سیاسی پارٹیاں نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ فرقہ پرست مسلمانوں کے سیاق و سباق میں تو کوئی دخل اندازی بالکل ہی ناممکن ہے کیونکہ مدرسوں کے اتنے وسیع جال میں پھنسنے مسلمانوں کے ان مچھواروں سے الجھنے کی طاقت کسی کے پاس نہیں۔

ایک مسئلہ اور بھی ہے۔ مدرسوں میں پڑھنے والے طالب علم اب عموماً ایسے گھرانوں سے آتے ہیں جہاں کوئی خواندہ نہیں ہوتا یا جو معمولی تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اور یہی بچے ان خاندانوں کی پہلی پڑھی لکھی کھیپ ہوتے ہیں۔ اس سے بالواسطہ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں میں جو خاندان پہلی دفعہ تعلیم کے دائرے میں شامل ہو رہے ہیں اگر ان کے بچے مدارس میں چلے جاتے ہیں تو ان کی کئی نسلیں نئی تعلیم سے بہرہ ور نہ ہو سکیں گی۔

دینی مدارس میں اپنے نظام تعلیم کا از خود تنقیدی جائزہ لینے کی صلاحیت کا تقریباً فقدان ہے۔ ان مدارس کے فارغین کا ذہن صرف ہدایات سننے اور ان پر مشینی طریقے سے عمل کرنے کا خوگر ہوتا ہے۔ نئے مضامین کا از خود مطالعہ کرنے اور ان پر غور و فکر کرنے کی صلاحیت یہ نظام تعلیم شاذ و نادر ہی پیدا کرتا ہے۔ نصاب کے طور پر وہاں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اسلام کے اس زاویے کو پیش کرتی ہیں جو صرف ملائیت کی توسیع میں معاون ہو سکیں۔ اخبارات، ادب کے مطالعے، کھیل کود اور ٹیلی ویژن جیسی چیزوں پر پابندی کے سبب دینی مدارس کے فارغین زندگی کے متنوع پہلوؤں سے واقف ہی نہیں ہو پاتے۔ ایک شہری کے طور پر مختلف حالات میں کس طرح اپنا ردِ عمل ظاہر کریں اور ان حالات کو کس طرح سمجھنے کی کوشش کریں، جو خصوصاً ہندوستان جیسے تکثیریتی معاشرے کے پروردہ ہیں، یہ صلاحیت ان طالب علموں میں عموماً پیدا نہیں ہو پاتی۔ مثال کے طور پر دنیا کے کسی بھی کونے میں مسلمانوں پر ہونے والے کسی بھی قسم کے ظلم کے خلاف تو وہ اپنا جذباتی ردِ عمل ظاہر کریں گے لیکن غیر مسلم پائمال طبقے پر ہونے والے انسانیت سوز مظالم تک پر ان کے کان پر جوں نہیں رنگتی، مظلوم غیر مسلموں کی آہیں ان کے جذبات کو اچھیختہ نہیں کرتیں۔ ایسی صورت حال میں حکومت کی طرف سے کی جانے والی کسی نا انصافی کی بامعنی مزاحمت یا معاشرتی طور پر تبدیلی لانے کی کوئی خواہش اور اپنے جمہوری حقوق کے حصول کی کوئی کوشش ہمیں دینی مدارس کے فارغین میں نظر نہیں آتی۔

اس روایتی نظام تعلیم کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے طلبہ اکثر مفاد پرست مسلم سیاسی عناصر کے شکار ہو گئے اور اس طرح منفی مسلم سیاست کو اپنے لیے ایک بڑا حلقہ (Constituency) میسر آ گیا۔ اعلیٰ طبقے کے جو لوگ مذہب کے نام پر سیاست کرتے ہیں یہ طلبہ ان کا سب سے آسان ہدف ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر

اس سیاق و سباق میں اُسامہ بن لادن، محمد عطا اور عمر شیخ جیسے لوگوں کی مثال دی جاسکتی ہے جنہوں نے مذہب کو ہتھیار بنا کر اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور ان مقاصد کے حصول کے لیے مدرسے کے طالب علموں کو فدائین کے طور پر بھرتی کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ القائدہ جیسی تنظیموں کے اکثر معروف لیڈر مغربی ممالک کے سیکولر تعلیم کے اداروں کے فارغین ہیں جو ابتدا میں امریکی مفادات کی خدمت بھی انجام دے چکے ہیں۔

ہندستان میں بھی، مذہب کے استحصال کی کئی بڑی نمایاں مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک مخصوص مسلم نظریہ زندگی سیاست کے افق پر انیسویں صدی کے نصف آخر سے سامنے آنا شروع ہوا۔ پھر بیسویں صدی کی ابتدا میں دیوبند تحریک کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ کچھ عرصے بعد جماعت اسلامی جیسی تنظیمیں مذہب کے مرکزی حوالے سے اپنے پرچم تلے احیا کے مقصد سے مسلمانوں کو جمع کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہونا شروع ہوئیں۔ کے ایم۔ اشرف نے اپنی کتاب *An Overview of Muslim Polity in India* میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۱۲ اور ۱۹۱۴ کے درمیان احیا پرست قوتوں کی معیت میں شروع ہونے والی تحریکیں (مثلاً ”احرار لیگ“ اور بعد میں علی برادران کی ”خلافت تحریک“) اپنے مقاصد کے حصول میں کیوں ناکام ہوتی رہیں۔ اپنے موقف کو مزید واضح کرتے ہوئے اشرف لکھتے ہیں: ”اس قسم کی ناکامیوں کا مسلسل منہ دیکھتے دیکھتے مسلمان عموماً ان سے بددل ہو گئے تھے اور پرانے عمائدین پر مزید بھروسہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ مایوسی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی پراگندگی ہر سود کھائی دیتی تھی۔“ مایوسی اور ذہنی پراگندگی کی اسی کیفیت کا شکار مسلم نوجوان طبقہ آج بھی ہے جب کہ معاشرے کے عمومی حالات بدل گئے ہیں۔ مسلمانوں کی عمومی پسماندہ معیشت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مفاد پرست قوتیں مدرسے سے آنے والے بے روزگار نوجوانوں کو مذہب کے نام پر مسلسل غلط راہ پر ڈال رہی ہیں۔ مذہب کے احیا، مسلم قوم پرستی اور برادرانہ اتحاد کے نام پر اولاً ان کے ذہنوں کو تبدیل کرنا آسان ہوتا ہے اور بعدہ جہادی کمیپوں میں تربیت لینے کے لیے آمادہ کرنا بھی کچھ مشکل نہیں رہ جاتا۔ یہ طالب علم عموماً غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اس قسم کے نظریات کو اختیار کرنے میں انھیں دو قسم کے فائدے نظر آتے ہیں: یعنی نام نہاد مذہبی فریضے کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ان کو روزی روٹی کا وسیلہ بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ رویہ ان غریب بے روزگار ہندوؤں سے قطعی مختلف نہیں جو کچھ پیسوں کی خاطر یا پھر مذہب کے نام پر بڑی آسانی سے ہندو فرقہ پرست تنظیموں کے چنگل میں آ جاتے ہیں۔

مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ان کے حقیقی مسائل کی طرف کوئی بھی توجہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ یہ مسائل دراصل ان کی تعلیم اور معاش کے مسائل ہیں، ان کے اقتصادی مسائل ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ مسلمانوں کا وہ مزاج بھی ہے جس کی وجہ سے مساوی حقوق کے حامل شہری کے طور پر وہ اپنے حقوق کا مطالبہ ہی نہیں کرتے اور تعلیم اور روزگار کے مواقع کے مطالبوں کے بجائے وہ مدارس کے فروغ اور تحفظ کی بات کرتے ہیں۔ قومی سطح پر سیاسی جماعتیں بھی مسلمانوں کی فکر میں تبدیلی لانے کے لیے کوئی مثبت کوشش نہیں کرتیں۔ صرف سیاسی کھیل کھیلتی ہیں، حمایت اور دشمنی کے تمام رشتے ووٹ بنک کی سیاست کے مطابق بننے بگڑتے ہیں اور ووٹ بنک کی سیاست نے آج چونچ اختیار کی ہے اس میں ہمارا موجودہ سماجی و سیاسی ڈھانچہ مسلمانوں کو مزید پس ماندگی کی طرف دھکیل رہا ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان خود یہ فیصلہ کریں کہ وہ مدارس کو بہ قدر ضرورت ہی زندہ رکھیں گے اور جو مدارس دینی تعلیم کا فریضہ انجام دیں گے ان کے نظام کو بھی از سر نو تشکیل دیا جائے گا۔ مسلمانوں کو اب یہ سوچنا ہی ہوگا کہ آج کے دور میں ان کی ضرورت صرف روایتی دینی مدرسے نہیں ہیں بلکہ انھیں اس جدید تعلیم کی بھی ضرورت ہے جسے عام دنیا اختیار کر رہی ہے اور ترقی کی راہوں پر آگے بڑھ رہی ہے۔ پیچھے کی طرف دیکھتے رہنے یا جدید تعلیمی نظام کے چند نقائص کی نشان دہی سے مسلمانوں کا کچھ بھلا نہ ہوگا۔ مسلمان اگر سیاسی اکائی کے طور پر حکومت سے تعلیمی سہولتوں کا مطالبہ کریں تو وہ آہستہ ہی سہی، مہیا ہو جائیں گی مگر ان سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمانوں کو اپنی فکر کے عہد وسطیٰ کے گرد طواف کرنے والے دائروں سے نکلنا ہوگا۔ اگر پندرہ کروڑ مسلمانوں کے پانچ کروڑ بچے کل وقتی دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرتے رہیں گے تو سماجی اور اقتصادی سطح پر آئندہ مسلمان کہاں ہوگا سمجھنا مشکل نہیں۔ یہ بات طے ہے کہ وہ اسکیمیں جو حکومت نے مدرسوں میں جدید کاری کے لیے شروع کی ہیں، معنی خیز نتائج ظاہر نہیں کر سکتیں۔ تعلیمی پس ماندگی بھی دور ہو سکتی ہے جب بنیادی خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر خود مسلمان اپنے مدارس کے معاملے میں کوئی روشن خیال پالیسی وضع کرنے کو تیار نہیں تو پھر حکومت کو بھی کیا پڑی ہے کہ وہ بلی کے گلے میں گھٹی باندھے۔ اس صورت میں چند نکلوں کے ذریعے مدارس کی جدید کاری کی پالیسی کا ڈھنڈورا ہر حکومت کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جس کی رقوم کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو دوسری فلاحی اسکیموں کا۔ یعنی اسکیم چلانے والے سرکاری افسر اور رضا کار تنظیموں کے ذمے دار مل کر انھیں ڈکار جاتے ہیں۔ □